۱۵ر جولائی ۱۹۷۱ء

ہفتہ وار
ہماری زبان

جلد ۳۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۲۷

اس شمارے میں

اداریہ

اردو میں درسی کتابوں کا مسئلہ

(۲)

۲۲ر جون کی اشاعت میں ہم نے اردو میں درسی کتابوں کے مسئلے پر روشنی ڈالی تھی اور اس سلسلے میں اردو زبان و ادب کی درسی کتابوں کے معیار کے متعلق کچھ اصولی باتیں کہی تھیں آج کی صحبت میں ہمیں اردو میں ابتدائی اور ثانوی منزل کے لئے دوسرے مضامین کی کتابوں کے متعلق کچھ کہنا ہے۔

اسکولوں میں جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں ان میں انگریزی، ہندی، اردو یا کسی دوسری ریاستی یا علاقائی زبان کے علاوہ حساب، تاریخ، جغرافیہ، سائنس (فزکس، کیمسٹری، بیالوجی) اور سوکس یا کہیں کہیں اقتصادیات کی کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو کے ابتدائی اسکول تو کسی نہ کسی تعداد میں ہر ریاست میں مل جائیں گے مگر ثانوی اسکول زیادہ تر مہاراشٹر، آندھرا، گجرات، میسور، بہار، مغربی بنگال، دہلی میں ہیں۔ ممکن ہے کچھ ثانوی اسکول دوسری ریاستوں میں بھی ہوں۔ ان ریاستوں کے ماہرین تعلیم اور ہماری انجمن کے شاخوں کے اراکین کو پہلے ان تمام کتابوں کی فہرستیں تیار کرانی چاہئیں جو ان کے اسکولوں میں درسی کتابوں کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ اس کے بعد انھیں یہ جانچ کرنی چاہئے کہ ان کتابوں میں تعلیمی نقطۂ نظر سے اور زبان کے نقطۂ نظر سے خامیاں تو نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ خامیاں ضرور ہوں گی۔ ان خامیوں کی نشاندہی کرکے مرکزی انجمن کی ماہرین کی کمیٹی کو مطلع کرنا چاہئے، ویسے مرکزی انجمن کی یہ کمیٹی اپنے طور پر بھی اس بات کی جانچ کرے گی۔ مرکزی انجمن ان تمام کتابوں کو بھی جمع کرے گی جو بیس پچیس سال پہلے ثانوی مدارس میں پڑھائی جاتی تھیں۔ ظاہر ہے یہ کتابیں اب بجنسہ کام تو نہیں آسکتیں مگر ان سے مدد لی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد، حسب ضرورت ہر مضمون کے لئے نئی کتابیں تیار کرنے کے لئے ماہرین کی علیحدہ علیحدہ کمیٹیاں بنائی جائیں گی اور اس کے ساتھ ساتھ ایسے طریقوں پر غور کیا جائے گا جن کی رو سے ان کتابوں کو منظور کرایا جائے۔ اصول یہ ہوگا کہ یہ کتابیں اول تو مضمون کی معلومات اس معیار تک فراہم کریں جو ثانوی درجے کی تعلیم کا ہے، دوسرے ان میں جدید ترین معلومات عام فہم انداز میں پیش کی گئی ہوں، تیسرے ان میں وہ اصطلاحات استعمال کی جائیں جو رائج ہیں اور اگر نئی اصطلاحات کی ضرورت ہو تو وہ بھی ایسی ہوں جو موجودہ دور میں بھی جا سکیں، چوتھے ان کو موجودہ تدریسی طریقوں کے مطابق ہونا چاہئے پانچویں ہر علاقے کو دیکھتے ہوئے مثالوں کے سلسلے میں اس علاقے کے مطابق مثالیں دی جائیں۔ جیسے

یہ کتابیں اچھی چھپی ہوں اور جہاں تک ممکن ہے اغلاط سے پاک ہوں، ساتھ ہی ان کی قیمت زیادہ نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ کام خاصا لمبا ہے، مگر کرنے کا ہے اور کرنا چاہیے۔ حکومت ہند کا ترقی اردو بورڈ یونیورسٹی کی منزل کے لئے اردو میں کتابیں تیار کر رہا ہے۔ ہر مضمون کے ماہرین نے چند ایسی کتابوں کی تیاری کی بھی سفارش کی ہے جو پری یونی ورسٹی یا انٹر کے درجے کے لئے ہوں گی "تاکہ طلبہ کا مضمون سے مناسب تعارف ہو سکے"، مگر نوّے فی صد کی کتابیں بی۔اے یا بی۔ایس سی یا بی کام کے لئے ہوں گی، امید ہے کہ دو سال کے اندر یہ کتابیں تیار ہو جائیں گی۔ اس عرصے میں ہمیں ابتدائی اور ثانوی منزل کی کتابوں کی تیاری کے لئے پروگرام بنا لینا چاہئے کیونکہ اگر اس منزل پر مناسب کتابیں نہ ہوئیں تو یونی ورسٹی کی منزل پر کتابیں اتنی مفید نہ ہو سکیں گی جتنی ہونی چاہئیں، ترقی اردو بورڈ کی دوسری میٹنگ میں یہ سوال بھی اٹھایا گیا تھا کہ بورڈ کو ثانوی منزل کے لئے بھی کتابیں تیار کرنی چاہئیں مگر وزیر تعلیم نے صاف کہدیا کہ یہ ریاستوں کے دائرۂ اختیار کی بات ہے اور مرکزی حکومت اگر اس میں دخل دے تو اس سے پیچیدگی پیدا ہو سکتی ہے، ہاں مرکز اس کام میں کچھ مالی امداد علیحدہ سے دے سکا تو ضرور دے گا۔ انجمن ترقی اردو ہند کی یہ کوشش ہوگی کہ اپنی ریاستی شاخوں کے تعاون سے اور ہر علاقے کے تجربہ کار استادوں اور ماہرین کے مشورے سے ابتدائی منزل سے لے کر ثانوی منزل تک کی ہر مضمون کی کتابیں تیار کرانے کے لئے اسکیم بنائے اور یہ اسکیم ایسی ہو کہ اس پر تمام ریاستوں میں عمل ہو سکے اور مقامی پاسداری یا علاقائی دفریت شاہی اس میں رکاوٹ نہ ڈال سکے۔ اس کام کو اب ٹالا نہیں جا سکتا۔ انجمن کی ماہرین کی کمیٹی کا عنقریب اجلاس ہونے والا ہے مگر یہ ضروری ہے کہ ریاستی شاخیں اپنے علاقے کے استادوں اور ماہرین کی مدد سے اس علاقے کی موجودہ درسی کتابوں کی فہرست مہیا کرائیں اور کمیٹی جب ان کتابوں کو دیکھنا چاہے تو اس کا بھی انتظام کر دیں، نیز اپنے علاقے کے لوگوں کے ان کے معیار کے متعلق تاثرات بھی مہیا کر دیں، یہ کام مشکل نہیں ہے اور اس کی اہمیت بنیادی ہے امید ہے کہ تمام متعلقہ حضرات اس طرف توجہ کریں گے۔ فی الحال اس سلسلے میں جنرل سکریٹری سے خط و کتابت کرنی چاہئے۔

والٹ وہٹ مین کی ۱۲ نظمیں

پروفیسر عبد الرؤف صاحب کی کتاب "والٹ وہٹ مین کی ۱۲ نظمیں" شائع ہو گئی ہے۔ اس میں والٹ وہٹ مین کی ۱۲ نظموں کے ترجمہ کے ساتھ سولہ صفحات پر شاعر کی زندگی کے حالات "تعارف" کے زیر عنوان قلمبند کئے گئے ہیں۔

ملنے کا پتہ: پروفیسر عبد الرؤف ۱۰م۔ تالتلیمی، کلکتہ ۱۲

• ایم۔اے۔ نصر

گجرات یونی ورسٹی سے اردو میں پی، ایچ، ڈی کی ڈگری

گجرات یونیورسٹی نے جناب محمد صبیح الدین خاں، افغانی سے پوری کے مقالے "شعرائے راجستھان" کو پی، ایچ، ڈی کی ڈگری کے لئے منظور کر لیا ہے۔

افغانی صاحب پہلے مقالہ نگار ہیں جنھیں گجرات یونیورسٹی سے اردو میں پی، ایچ، ڈی، کی ڈگری عطا کی جانے والی ہے۔

• ابراہیم شیخ ایم، اے (ناسک)

میرٹھ کالج میں اردو ایم اے

میرٹھ:۔ اس سال پہلی بار میرٹھ کالج میں اردو ایم اے کی کلاسیں شروع ہو رہی ہیں اردو کلاس کے لئے پرد و مینرنٹل داخلوں کی اجازت مل گئی ہے۔ • الجمعیۃ دہلی

ڈاکٹر نورالسعید اختر

قصۂ حسن و دل

سے

متعلق کچھ اور معلومات

مشرقی زبانوں میں قصۂ حسن و دل کو وقتاً فوقتاً موضوع بنایا گیا ہے۔ چنانچہ سنسکرت، گجراتی، فارسی (ایران، ترکی، فارسی ہندوستان)، قدیم اردو اور مراٹھی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان زبانوں میں بھی یہ قصہ خصوصیت کے ساتھ مقبول رہا ہے۔ میرا ایک طویل مضمون "قصۂ حسن و دل مختلف زبانوں میں" کے عنوان سے "شیرازہ" سرینگر، جلد ۔۸۔ شمارہ (۲) میں شائع ہوا تھا۔ مسلسل تلاش و جستجو کے بعد مضمون نگار کو اسی سلسلے کی چند اور کڑیاں ملی ہیں جن کی تفصیل ذیل کی سطور میں پیش کی جا رہی ہے۔

۱۔ قصۂ حسن و دل کے ضمن میں کرشن مشر کی پربودھ چندرودے (۱۰۵۰ – ۱۱۰۵) کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے خالق باری، کے مقدمے میں کشن داس بھٹ کی تصنیف کا ذکر کیا ہے۔ یہ بھی قصۂ حسن و دل پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے کہ کشن داس بھٹ نے کرشن مشر سے متاثر ہو کر اپنے انداز میں یہ کتاب لکھی ہوگی۔ افسوس ہے کہ اس کتاب کا سنہ تصنیف نہ معلوم ہو سکا۔ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ پربودھ چندرودے کے بہت بعد کی تصنیف ہے۔

اس قصے سے متعلق فارسی زبان کے تقریباً نو قصوں کا سراغ لگ سکا تھا۔ فارسی زبان کے تین مزید قصوں تک میری رسائی ہوئی ہے۔

حدائق العشاق۔ ملا رضی بن محمد شفیع کی فارسی رمزیہ تصنیف کا نام ہے۔

اس میں بھی روح، عقل، عشق، حسن اور دل کو تمثیلی جامہ پہنایا گیا ہے۔ یہ کتاب نثر میں ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے اسے غلطی سے مثنوی بتایا ہے۔ [آجکل - اپریل ۱۹۶۲] حدائق العشاق پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر نیر مسعود رضوی لکھتے ہیں:۔

"حدائق العشاق کا اسلوب بہت رنگین اور لفظی
اور معنوی صنعتوں سے گراں بار ہے اور ظہوری
کی "سہ نثر" کی یاد دلاتا ہے۔ سرور خود بھی رنگین
نثر لکھتے تھے لیکن ملا رضی کی پیچیدہ اور دقیق عبارت
کے سامنے سرور کی بلاغت، فصاحت اور رنگین
نثر نگاری سلاست معلوم ہونے لگتی ہے"

(رجب علی بیگ سرور: نیر مسعود رضوی ص ۲۸۲)

مثال کے طور پر حدائق العشاق کی نثر کا ایک جز ملاحظہ ہو۔

"توجہ رایات ظفر آیات خسرو داور حشمت بہ عزم
رزم عشق آسمان جاہ با عموم لشکر و جمہور سپاہ"

سنیم سیراگی:۔ سوامی بھوپت رائے سنیم بیراگی کھتری ذات کے تھے۔ شعر و شاعری میں افضل سرخوش سے تلمذ تھا۔ ان کی کئی تصانیف ہیں۔ جن میں پربودھ چندرودے ناٹک اور مثنوی قصص فقرائے ہند کو ہندوستان میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ مخزن الغرائب میں سنیم سے متعلق لکھا ہے کہ

"از قانون گویان پنجاب متوطن پٹن از سرکار جونا
(متوفی سنہ ۱۱۳۲ھ)"

بنوالی داس ولی۔ کہتے ہیں کہ دارا شکوہ کے مصاحبوں میں سے تھا۔ سنہ ۱۰۶۳ھ میں ایک رسالہ "راجاولی" تصنیف کیا جو ہندو راجاؤں کے حالات پر مشتمل ہے۔ ولی کی بہت سی مثنویاں ملتی ہیں۔ مثلاً "بحر عرفاں" وغیرہ جو اکثر متصوفانہ خیالات کی حامل ہیں۔ ولی نے "گلزار حال" کے عنوان سے قصۂ حسن و دل کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کام میں ولی کی مدد بھوانی داس نے کی (خالق باری مرتبہ شیرانی ص ۵۰) بھوانی داس، لچھمی نراین شفیق کے دادا کا نام تھا۔ اغلب ہے کہ ولی کی مدد انھوں نے ہی کی ہوگی۔

اردو کے نو قصوں تک میری رسائی ہو سکی ہے۔ اس کے بعد تین اور قصوں کا پتہ چلا ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو۔

سوامی نند داس:۔ بنوالی داس ولی نے "گلزار حال" کے مقدمے میں سوامی نند داس کے تالیف کردہ پربودھ چندرودے ناٹک کا ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "پربودھ چندرودے ناٹک کہ در زبان گوالیاری تالیف سوامی نند داس کہ اصلاً بزبان سنسکرت کشن داس تصنیف کردہ بود، بنوالی المتخلص بہ ولی بہ امداد بھوانی داس در فارسی ترجمہ کردہ بود" (خالق باری مرتبہ حافظ محمود شیرانی ص ۵۰)۔ کیا عجب ہے کہ ملا اسد اللہ وجہی نے سوامی نند داس کا تالیف کردہ ناٹک دیکھا ہو کیونکہ سب رس کی ابتدا میں وہ "گوالیر کے چاتراں" کی زبان کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں۔ یہاں پر پروفیسر جاوید وششٹ کے ایک بیان کی تردید ہوتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ملا وجہی کے عہد میں قصہ حسن و دل لوک کتھا کا روپ دھار لیا تھا (نوائے ادب جنوری سنہ ۱۹۶۰ء مضمون بعنوان "ملا وجہی پر سرقہ کا الزام غلط ہے") یہاں پر طویل بحث کی گنجائش نہیں ہے صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وجہی کا علمی پس منظر نہایت وسیع تھا۔ وہ بڑی حد تک سنسکرت زبان سے بھی واقف تھے۔ لہذا "قصہ حسن و دل" انھوں نے سنسکرت، فارسی اور گوالیاری زبانوں میں دیکھا اور اس سے متاثر ہوئے۔

شاہ تراب چشتی :- بارہویں صدی ہجری میں دکن میں جو برگزیدہ صوفیائے کرام گزرے ہیں ان میں شاہ تراب کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی کئی تصانیف ہیں۔ حال ہی میں میں نے ان کی ایک تصنیف گیان سروپ "اہالیان ادب کے سامنے نوائے ادب جنوری سنہ ۱۹۸۰ء کے ذریعہ پیش کی ہے۔ ان کی اکثر تصانیف کا مرتا سر موضوع تصوف ہے۔ سنہ ۱۱۷۱ھ ہجری میں میں انھوں نے ایک مثنوی بنام "ظہور کلی" لکھی۔ اس میں ۴۲ ابواب ہیں۔ اس مثنوی کے ۲۸ ویں اور ۲۹ ویں باب کافی دلچسپ ہیں۔ اس میں حسن و عشق کی اصطلاحوں کی مدد سے حسن حقیقی اور عشق الٰہی کے اسرار فاش کئے گئے ہیں۔ ان ابواب سے متعلق ڈاکٹر سید جعفر حسن سجادی نے مقدمے (ص ۶) میں لکھتی ہیں کہ شاہ تراب کے یہ دو ابواب وجہی کی "سب رس" کی یاد دلاتے ہیں۔ جس میں اسی طرح تمثیلی انداز میں حسن، عشق، زلف اور چشم و ابرو کی علامات میں وجہی نے "مشاہدہ حق کی گفتگو" کی ہے۔

مثنوی جان جہاں ۔ خاتم کی مثنوی حسن و دل پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند نے "تحریر" کے ایک شمارے میں حکیم میر علی خاں حالی کی مثنوی جان جہاں کا ذکر کیا ہے۔ یہ مثنوی سنہ ۱۲۷۱ ہجری مطابق سنہ ۱۸۵۵ء میں لکھی گئی۔ اس کا قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ میں موجود ہے۔

گلزار سرور :- اردو والوں کے لئے رجب علی بیگ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ اردو نثر نگاری میں سرور ایک خاص اسلوب کے موجد ہیں۔ ان کے ترجموں میں بھی ایک خاص کشش اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ "گلزار سرور" دراصل "حدائق العشاق" کا ترجمہ ہے جو سرور نے مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ بہادر والیِ بنارس کی فرمائش پر کیا تھا۔ سرور کا یہ ترجمہ ان کے اور ترجموں سے زیادہ رنگین ہو گیا ہے حالانکہ انھوں نے اسے مایوسی، غریب الوطنی اور پژمردگی کے زمانے میں تحریر کیا۔ اس میں انھوں نے کئی جگہ تصرف سے بھی کام لیا ہے اور بقول نیر مسعود "کئی موقعوں پر ترجمہ کرتے کرتے سرور کے اندر چھپا ہوا انشا پرداز سامنے آ جاتا ہے اور وہ "حدائق العشاق" کے مطالب کو پس پشت ڈال کر اپنے تخیل سے کام لینے لگتے ہیں۔" (رجب علی بیگ سرور از نیر مسعود ص ۲۸۶)

گلزار سرور پر مرزا غالب نے تقریظ لکھی تھی اس تقریظ کے چند جملے یہاں پیش کئے جاتے ہیں: "یہ جو "حدائق العشاق" کا فارسی زبان سے عبارت اردو میں نگارش پانا ہے، ارم کا زمین دنیا سے اٹھ کر بہارستان قدس کا ایک باغ بن جانا ہے ...... انشاء اللہ تعالیٰ یہ نقش صفحۂ روزگار پر یادگار رہے گا۔ مصنف کا شہرہ رنگین بیانی میں ...... تا روز شمار رہے گا۔"

جنگ عشق :- ڈاکٹر گیان چند نے "حدائق العشاق" کے ایک اردو منظوم ترجمے کی طرف ہماری نشاندہی کی ہے۔ (آجکل، اپریل سنہ ۱۹۶۳ء) امام بخش صہبائی کے ایک شاگرد عبدالرحمٰن حیرت نے "جنگ عشق" کے نام سے سنہ ۱۲۸۶ھ / سنہ ۱۸۶۹ء میں "حدائق العشاق" کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔

(باقی صفحہ ۹ سے آگے)

برگزیدگان محبت کی تعداد ادیوں اور بھی کم معلوم ہوتی ہے کہ جب تک کسی اور وسیلہ ان میں شہرت نہ پالیں، کوئی انھیں گنتا نہیں۔ مگر گہرے جذبات راز طلب ہیں اور چمک بھڑک والا سماج خوب جانتا ہے کہ کون سی خواہش ان تمام دوسرے جذبات سے برسرپیکار ہوتی ہے، جا سے گھوم گھوم کے ناچنے پر اکساتے رہتے ہیں۔ اوپر اٹھنے کے لئے ہلکا ہونا چاہئے! معاشرتی معراجیں حقیقی محبت کا ساتھ نہیں دے سکتیں، جو ہمیشہ بوجھل ہوتی ہے!

کسی بشر کو جی جان سے چاہنا اپنی تقدیر کی بازی لگانے کے سوا کچھ نہیں۔ اسی وجہ سے بھی محبت مطلق اتنی نایاب ہے کہ اس کے لئے داؤ پر بہت زیادہ لگانا پڑتا ہے۔ جیتنے کے اتنے کم امکان کے ساتھ اتنا بڑا جوا کھیلنے کے لئے یا تو دولت قارون کا مالک ہونا چاہئے ورنہ کم از کم نیم پاگل!

سرخی نسل کے چھوٹے بچے جلدی سے حساب لگا لیتے ہیں کہ کتنی وقت، کتنی توانائی، کتنا سرمایہ محبت کی قیمت ہوگی اور دیکھ لیتے ہیں کہ ہوس کی راہیں کم گراں اور کم دشوار ہیں۔ اسی لئے وہ ایک قدیم مقدس اصول کے ماتحت اور عام طور پر بزرگوں کے مشورے کے مطابق طے کر لیتے ہیں کہ جوانی عیش اٹھانے کے لئے ہے۔ اس سے مستفید ہوں۔ یعنی وہ ایسے لذات اور جذبات پر مرتے رہتے ہیں، جو ان کی دنیاوی کامیابیوں کی راہ نہیں روکتے۔

(ان حالات میں) ہم خود کو یہ اعلان کر کے تشفی دیتے ہیں، ضمیر کی عدالت سے معاف کراتے ہیں، ڈھارس بندھاتے ہیں کہ محبت عظیم کہیں ہوتی ہی نہیں، اس کا وجود محض ادبی ہے!!

یہ صحیح ہے کہ عزت کی طرح محبت بھی ایسا حرف ہے جو عملی دنیا میں کم داخل ہوتا ہے اور اگر اس کی گفتگو آ جاتی ہے تو اس سے مراد اس کے لئے جینے والے، اسی کے لئے مرتے ہیں!!!"

مرزا سعید الظفر چغتائی

محبّت ؟

فرانسیسی اخبار (۳)

فرانسوا ز پارتیوریے FRANCOISE PARTURIER فرانس کی جواں سال خاتون ناول نگار ہیں۔ ان کی عمر تنا اس کی متلاشی ہے، بقول اقبال ع

"پالتا ہے جسے آغوشِ تخیل میں شباب"

کائناتِ وجود کا ہر ذرّہ اس بنیادی جذبے کی کارفرمائی کا رہینِ منّت ہے جسے محبت کہتے ہیں۔ اس لئے جب سے ذہن کی تاریخ ملتی ہے اس مسئلہ پر غور و خوض اور اظہارِ خیال ملتا ہے۔ بعض وجود کی گوناگونی اور دنیائے رنگ و بو کی بوقلمونی آج تک دیسی ہی باخبر ہے۔ محبت، حسن اور فنونِ لطیفہ ایک تثلیث کے تین رکن ہیں، حسن، تلاشِ حسن، حسن آفرینی یا تر جمانیٔ حسن انسان کے ہر بلند سطح کے عمل کے محرک ہیں، باقی جو کچھ انسان کرتا ہے یا خود فراموشی ہوتی ہے یا اس درجۂ عمل کی تیاری۔ اگر اس تثلیث تک انسان کی سو لہ آنے رسائی ہو جائے تو یہ سارا سلسلۂ حرکت و عمل دفعتاً رک جائے۔ اور اگر کسی وقت یہ دلفریب جادو نظارے اوجھل ہونے لگتا ہے تو انسان چاہتا ہے کہ زندگی سے منہ موڑ لے۔ اس لئے دوری و حضوری کی دھوپ چھاؤں قائم رہنا ضروری ہے۔

حسن کائنات کے ہر ذرّے کی تلاش، اور محبت ہمارے گوشت پوست کے جسم کے ایک ایک جوہر کا تقاضا ہے۔ تکمیلِ آرزو کی شان یہ ہے کہ وہ تمام ذرّے اور جوہر جو ایک جسم کی تعمیر کرتے اور مختلف افعال و اعمال پر مامور ہیں یوں آسودہ ہوں کہ نہ کوئی رونگٹا تشنہ رہ جائے اور نہ دماغ کے کسی ادنیٰ جزو میں تمنا کا خفیف سا بھی احساس باقی رہ جائے۔ اسی آسودگی تمام کو روحانی حظ کہتے ہیں، یہ اس جزوی آسودگی سے ممتاز اور کہیں افضل ہے، جس میں انسان کسی قوی تر ہیجان کے زیرِ اثر اپنے بعض تقاضوں سے مصالحت اور بعض تصوّرات یا خوابوں سے رجوع کرلے۔ عملی دنیا میں برابر ایسا کرنا پڑتا ہے اور ہم ساری سے مایوس ہو کے آدھی پر قناعت کر لیتے ہیں۔ آج کی مکانکی دنیا میں جب۔

ع لذتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

یہ طرزِ عمل زیادہ نمایاں ہو گیا ہے۔ افراد بہ ناامیدی، بہر حال قیمتی کی زندگی پر نیم آسودگی کو ترجیح دے سکتے ہیں۔ شاید آرزوئے حیات اس طرح زیادہ برگ و بار لاتی اور زندگی کو زیادہ متحرک و فعال، زیادہ متلاشی، زیادہ حقیقت شناس اور کام کی بناتی ہو۔ لیکن بہر حال انسانی زندگی کا یہ بڑا المیہ ہے کہ بقول رومی ع

یافت می نشود جستہ ایم ما

اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو اصولی تصور کے مطابق محبت کا حل وہ مقصودِ وجود ہے کہ جس کی تکمیل کے بعد جینے کی آرزو باقی نہ رہے جیسے وجود کے بنیادی ذرّے الیکٹرون کی دونوں شکلیں مثبتوں POSITRON اور منفیوں NEGATRON باہم پیوست ہو کے فنا ہو جاتی ہیں اور توانائی کا ایک ذرّہ PHOTON ان کی جگہ وجود میں آتا ہے۔ ہماری جسامت پر یہ عمل صرف ایک ادنیٰ جزو بدن کی حد تک، وہ بھی کسی حد تک ظہور میں آتا ہے۔ گویا اس جسم کو ترکیب دینے والے لاتعداد ذروں کی قسمت میں ہمہ وقتی لذّتِ وصل کا کمال ہی نہیں۔ شاید اسی لئے کہ انسانی محبت کا کمال جنس و جسم سے گزر کے کسی اعلیٰ تر مقصودِ حیات کے لئے مر مٹنے میں مضمر ہیں، جہاں تڑپتے ہوئے لاشے کا رقص بسمل آسودگیٔ تمام کی منزلیں طے کرتا ہو۔ صلیب عیسائی آرٹ کا بڑا مقبول موضوع ہے۔ مگر بدوین RODIN کے بقول خلاق ذہن نے صلیب کو

ارشد صدیقی

اَمی بلا ہل

جب تری چشمِ فسونگر کی کوئی بات چلی
دل سے اک موجِ طرب بہرِ ملاقات چلی
دوش پر لیکے صبا رنگوں کی سوغات چلی

رنگ جو کے بھی ہیں امرت بھی ہیں اور زہر بھی ہیں
تیری ہی چشمِ فسوں ساز و فسونگر کی طرح
محزن کیف بھی ہیں لطف بھی ہیں قہر بھی ہیں
اک کرن پار ہوئی روح کی گہرائی سے
وادیٔ دل میں ہر رنگ آ جائے بچھڑے
جھوم کر گرنے لگے فکر کی شاخوں سے گلاب
ہر طرف سے لب گفتار کے بھونرے ٹوٹے
صبر کے ہاتھ سے احساس کے دامن چھوٹے
تیرے کوچے کی طرف یادوں کی بارات چلی

ٹ امی بلاہل، مدھر ہے ایام، سویت ارتنار
جنیت، مرت، تھک تھک پرت جہیں چھوٹ آکار

(بہاری)

لہ سلسلے کے لئے "ہماری زبان" ۱۵ اپریل اور ۱۵ مئی کے شمارے ملاحظہ ہوں۔

معشوقہ بنا کے تراشا، جس سے ہم آغوش ہونے جا رہے ہیں۔"

اس تصورِ جہاں نے اکثر انسان کو ماورائیت کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور کیا ہے ہماری رجائیت اور انصاف پسندی تقاضا کرتی ہے کہ اگر ہماری جانی بوجھی مادی زندگی میں وہ گوہرِ یک دانہ نہیں تو اس کے باہر، اس سے پرے ضرور ہوگا۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ رجائیت طفلانہ تو نہیں؟

فرانسواز کے ذہن اور اس کی نفسیات کو بنانے والی دنیا اور اس کے حقائقِ دیدہ و شنیدہ ایک حد تک ہم سے بہت ملتے جلتے اور ایک حد تک بہت مختلف ہیں۔ یہ مضمون اس کی آپ بیتی کا ایک ورق، دل سے دفعتاً اٹھنے والا دھواں اور ضمیر کی بے ساختہ فریاد ہے۔ اس کی بہت سی باتیں ایسی معلوم ہوتی ہیں، جو ہم مشرقی روز بنائے رہتے ہیں، لیکن غور سے دیکھا جائے تو کوئی باتیں نئی، اور مجموعی نقطۂ نگاہ اس کا اپنا ہے۔

انسان کا دل کثرتِ نظارہ سے وا ہوتا، اور اس کا ذہن جھٹکوں سے کھلتا ہے۔ کتنا عجیب، کتنا انوکھا، کتنا منفرد اور پھر بھی کتنا ایک جیسا ہے!

"ٹھیک ہے" جس خط کا مجھے انتظار تھا مل گیا۔

محترمہ آپ اتنی سنجیدہ کیوں ہوئی جا رہی ہیں؟ نئے سال کے موقع پر کچھ پیار محبت کی باتیں کریں! جیسے محبت کا موضوع بہت ہلکا دلنشیں، آسان اور خیر (عام) ہو۔ . . . .

ذاتی طور پر میں سمجھتی تھی کہ جینے یا کہنے کے لئے محبت سے زیادہ مشکل لفظ نہیں ہے۔

— آج؟ تمہارا عقیدہ یہ؟ ہم سے ایسا کہہ رہی ہو یہ تم، چار دن کا عاشق لکھنے کے بعد؟

بالکل، اگر میری کتابیں تمہیں خوش خرم یا ہلکی معلوم ہوتی ہیں، تو اس لئے کہ وہ محبت کی نہیں، بلکہ اس کی غیر موجودگی اور اس سے انکار کی ترجمانی کرتی ہیں اور اس کی کہ غرور، ضد، دکھاوا، مفاد پرستی، تھکن اور سب سے بڑھ کے احتیاط کیسے دل کی بڑی سے بڑی آرزو کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ میں نے ان عورتوں کا طرزِ عمل بیان کیا ہے جو جذباتی دنیا کے ہنگاموں سے بچ نکلنے کی مدعی ہیں، لیکن جسمانی لذت سے کنارہ کش نہیں ہوتیں۔ محبت کی نفی کا یہ طرزِ عمل آتا ہی پرانا ہے جتنی یہ دنیا مگر

پچھلے زمانے میں یہ آدم کے بیٹوں کی میراث تھی، ہماری صدی کی جدت یہ ہے کہ نصف انسانیت نے بے راہ روی میں دوسرے نصف جیسے حقوق حاصل کرتے ہیں، تاہم اس طرح ایک رسم ہی بدل رہی ہے، نفسِ محبت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس مسئلے سے ماہر سماجیات نپٹتے رہیں کہ آج بات جسم سے جان تک جاتی ہے، جبکہ پہلے لب و رخسار تک پہنچنے سے پہلے روح کو مسخر کرتے تھے۔ جن حالات میں محبت کی آگ بھڑکتی ہے، ان کا پہلے سے اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اور جس استثنائی جذبے کو روحِ محبت کہتے ہیں وہ سماجی الٹ پلٹ سے بے نیاز ہے۔ وہ ہمیشہ اتنا ہی نادر ہے جتنا کبھی تھا، بلکہ شاید ہمارے شب و روز اسے نادر تر بنا رہے ہیں، کیونکہ جو مروت کا برتاؤ ان جذبات کو پروان چڑھاتا تھا، اب اس کا رواج اٹھتا جاتا ہے۔ لیکن محبت کو مردہ فرض کر لینا اور سوچنا کہ پہلے کی چاہت بہتر ہوتی تھی، ایک دُہرا جھل مرکب ہے۔ پوری نسلِ انسانی کے گھٹیا پن کو مان لینے کے بجائے کسی ایک معاشرے یا نسل کو ملامت کرنا ایک قسم کا غرور نہیں تو اور کیا ہے؟

تاریخ بڑی بردبار ہے۔ کیا یہ مان لینا ایمانداری کی بات نہیں کہ ہر زمانے میں ہر غیر معمولی چیز کی طرح جذبۂ محبت بھی استثنائی رہا ہے؟ کیوں نہ تسلیم کر لیں کہ محبت کا شاہکار بنانا عاشق کے لیے بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی سردار قوم کے لئے؟ ہر شخص لکھ سکتا ہے، مگر ہر شخص بے رنیس نہیں لکھ سکتا۔ فنونِ لطیفہ، سیاست، جنگ، سب کے اپنے منتخب نمائندے ہیں محبت کے بھی ہیں۔

(باقی صفحہ ۹ پر)

لہ AMANT JOUR DE CING۔ لفظی ترجمہ ہوا پانچ دنوں کا عاشق۔ مصنفہ کے ناول کا نام۔

ٹہ BERENICE بے رنیس۔ تین مصری رانیوں کا نام رہا ہے۔ لیکن ادبی داستان میں رنگ اس نام کی ایک یہودی شہزادی نے بھرا جو سن ۲۸ء میں پیدا ہوئی۔ رومی شہنشاہ ٹیٹس TITUS اسے بیاہنا چاہتا تھا۔ لیکن رعایا کی ناراضگی کے ڈر سے آخرش اسے واپس بھیجنا پڑا۔

۱۶۷۰ء میں فرانسیسی ڈرامہ نگاروں راسین RACINE اور کورنے CORNEILLE نے ٹیٹس اور بے رنیس کی حکایت نظم کی۔ راسین کا المیاتی ڈرامہ صنف کی بہترین مثال سمجھا جاتا ہے۔

مراسلات

خود نوشت مخطوطۂ غالب پر ڈاکٹر انصار اللہ کے مشاہدات

۲۲ مئی ۱۹۷۱ء کے ہماری زبان میں ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر کے تازہ ترین مشاہدات نظر سے گزرے۔ اس کے علاوہ اسی مہینے یعنی مئی میں ان سے مفصل ملاقات اور تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ اول تو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اس نسخے کی لاانتہائی بحث سے عام قاری عاجز آگئے ہیں اور میں معذرت کے ساتھ اس موضوع پر لکھ رہا ہوں۔ دوسرے یہ کہ میں نے ملاقات میں انصار اللہ پر یہ واضح کر دیا کہ میں علمی اختلاف کو شخصی تعلقات پر اثر انداز نہیں ہونے دیتا۔ وہ بخوشی میری تحریروں سے اختلاف کریں اور میں ان پر اعتراض کروں لیکن میرے دل میں ان کے لئے جو مقام ہے اس میں فرق نہ آئے گا۔

اپنی تحریروں میں بھی اور حالیہ ملاقات میں بھی نظر صاحب نے یہ ماننے سے انکار کیا کہ غالب اپنے کلام میں اصلاح کر کے سابق متن پر رجوع کر آتے تھے۔ میرا کہنا ہے کہ کلام غالب کی مختلف منزلوں کا مقابلہ کیجئے تو اس کی مثالیں بکثرت ملیں گی لیکن دقت یہ ہے کہ انصار صاحب کسی مجموعے کی تاریخ یا متن کو تسلیم کرنے پر ہی آمادہ نہیں۔ وہ نسخۂ بھوپال اول کے ترقیمے کی تاریخ اور نسخۂ شیرانی کے حاشیوں کے نوٹ 'از بانده مخرشادہ' وغیرہ کے باوجود ان نسخوں کی معروف تاریخ کتابت کو اس لئے نہیں مانتے کہ "یہ غالب کے ہاتھ کی تحریر نہیں۔ دوسرے کاتب کا کیا بھروسہ۔ معلوم نہیں اس نے کب کے لکھے ہوئے نسخے کی کیسی نقل کی ہے۔" گویا ان کے نزدیک ان نسخوں کی تاریخ اور متن دونوں مشکوک ہیں۔

اب ایک مثال میں لفظ 'شوخی' اور 'شہرت' کی تبدیلی دیکھئے۔

(۱) نو دریافت خود نوشت مخطوطے میں مصرع ہے ؎

ہر دہن شرم ہے باوصف شوخی اہتمام اس کا

نسخۂ بھوپال اول میں شوخی کی جگہ شہرت ہے۔ نسخۂ شیرانی میں پھر شوخی ہے اور گل رعنا میں پھر بدل کر شہرت ہو گیا ہے۔ انصار صاحب ان نسخوں کی تقدیم و تاخیر کو کسی طرح الٹ پلٹ لیں لیکن یہ ماننا ہوگا کہ غالب کے مزاج میں تلون تھا اور وہ منسوخ متن کو پھر سے بحال کر دیتے تھے۔

انصار صاحب دوسرے کاتبوں کے لکھے ہوئے نسخوں کے مطالب کو نہیں مانتے۔ میں نے کہا کہ دیوان کے پہلے اور دوسرے مطبوعہ ایڈیشن میں بھی اس قسم کا فرق دکھائی دیتا ہے۔ انصار صاحب نے کہا کہ "مطبوعہ کا بھی کیا بھروسہ۔ ہم روز دیکھتے ہیں کہ کاتب کچھ کا کچھ لکھ دیتا ہے اس لئے کیوں کر مانیں کہ دوسرے ایڈیشن میں پہلے ایڈیشن سے جو فرق ہے وہ غالب کا کیا ہوا ہے۔ کیا معلوم وہ کاتب ہی کی اصلاح ہو۔" میرا اشارہ ذیل کی تبدیلی کی طرف تھا۔

(۲) خود نوشت نسخے میں ایک شعر ہے ؎

عارض گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد
جوشش فصل بہاری اشتیاق انگیز ہے

نسخۂ بھوپال اول، نسخۂ شیرانی، نسخۂ رامپور قدیم اور دیوان کی طبع اول ۱۸۴۱ء میں عارض گل کی جگہ 'جلوۂ گل' ہے لیکن ۱۸۴۷ء کی طبع دوم اور اس کے بعد کے تمام ایڈیشنوں اور مخطوطوں میں پھر عارض گل ہے۔ اب نظر صاحب خود نوشت نسخے کو طبع اول ۱۸۴۱ء کے بعد کا مکتوبہ مانیں تو دوسری بات ہے ورنہ انھیں ماننا ہوگا کہ اس مثال میں بھی غالب نے متن کی تنسیخ و بحالی میں رجوع سے کام لیا۔ ایسی مثالیں ایک دو نہیں متعدد ہیں۔

میں تحقیق میں احتیاط کی اہمیت کا قائل ہوں لیکن احتیاط حد سے بڑھ کر محض وہم ہو جاتی ہے جس کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر انصار اللہ جس طرح خفائی التشکیک ہو گئے ہیں انھیں قائل کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ وہ غالب کے کسی مخطوطے کے متن اور تاریخ کو اس لئے معتبر نہیں مانتے کہ وہ غالب کے ہاتھ کی تحریر نہیں۔ جن تحریروں کو غالب کے ہاتھ کی کہا جاتا ہے انھیں وہ اس لئے غالب کی تحریر نہیں مانتے کہ غالب نے اپنی کسی اور تحریر میں (جو انصار صاحب کے نزدیک غالب کے ہاتھ کی ہو) اس دوسری تحریر کو اپنے قلم کی نگاشتہ نہیں قرار دیا۔ وہ غالب کے کسی ایڈیشن کے متن کا اس لئے اعتبار نہیں کرتے کہ اس کی کاپی غالب کے ہاتھ کی لکھی نہیں۔ ان کے ان شکوک کا اندازہ ان سے بات چیت کرنے پر ہوا۔

میرا خیال ہے کہ ادب اور زندگی دونوں میں اس قسم کے چشم دید قسم کے ثبوت پر اصرار کرنا مناسب نہیں۔ جہاں ہیپنگ کے CIRCUMSTANCIAL EVIDENCE جیسے پر بھی تکیہ کر لیا جاتا ہے مثلاً عدالتوں میں آئے دن جج لوگ شخص گواہ کے بیانات پر باور کر کے قاتلوں کو پھانسی کی سزا دے دیتے ہیں حالانکہ ملزم نے جج کی آنکھوں کے سامنے خون نہیں کیا ہوتا۔ ہم سب اپنے والد کو اپنا والد مانتے ہیں حالانکہ اس کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ہوتا۔ اردو ادب میں ولی، میر، آتش، ناسخ، امیر، انیس، رجب علی بیگ سرور کی تصانیف کو ان کے مصنفوں کی ماننا پڑتا ہے حالانکہ ان کا متن مصنف کے قلم کا لکھا نہیں ملتا۔ اردو سے باہر نکل کر رامائن، مہابھارت، گیتا، شکنتلا ناٹک، شاہنامہ وغیرہ کو ان کے

مصنفوں کی تصنیف مانتے ہیں حالانکہ ان کے مخطوطات مصنفوں کے لکھے تو درکنار تصنیف سے کئی سو سال بعد تک نہیں ملتے۔ اس لئے غالب کے معاملے میں بھی غیر معمولی شدت کی ضرورت نہیں۔

انصار اللہ صاحب نے مضامین میں دو بزرگوں کے نجی خطوط کے اقتباس سند کے طور پر پیش کرتے ہیں لیکن یہ کیا ستم ہے کہ ان کے نام پوشیدہ رکھتے ہیں۔ استناد کا یہ کون سا طریقہ ہے؟ انصار اللہ صاحب نے مجھے بتایا کہ لوہے کے قلم والا نکتہ اٹھانے والے صاحب ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ہیں۔ ملتان کے بزرگوار کے بارے میں انھوں نے مجھے نہیں بتایا۔ بہرحال اگر ان کی رائے کو پیش کرنا ہے تو ان کا نام دینے میں کون سا خدشہ ہے اور بے نام کی رائے کی کیا وقعت ہے!

۲۲ مئی کے مضمون میں انصار اللہ صاحب نے میرے ایک جملے پر بھی اعتراض کیا ہے۔ "ڈاکٹر انصار اللہ کے عالمانہ اعتراضات کے باوجود اسے غالب کی تحریر نہ قرار دینے کو جی نہیں چاہتا۔"

میں واضح کر دوں کہ تاثراتی تنقید کے برعکس 'تاثراتی تحقیق' نہیں ہوتی اور میں تحقیق میں ہرگز جی چاہنے یا نہ چاہنے کی بنا پر فیصلہ نہیں کرتا۔ میرا مطلب صرف یہ تھا کہ انصار صاحب کے اعتراضات اس قدر کافی و شافی نہیں کہ میرا دل و دماغ ان سے مطمئن ہو کر نسخے کو غالب کے ہاتھ کا نہ ماننے پر تیار ہو جائے۔ مجھے امید ہے کہ اس صراحت کے بعد انصار اللہ مجھے تحقیق کا نام لیتے رہنے کی اجازت دیں گے۔

اس نسخے کی بحث میں زیادہ تر زور اس نکتے پر صرف ہوا ہے کہ یہ غالب کے ہاتھ کی تحریر ہے کہ نہیں۔ میرے نزدیک یہ پہلو اتنا زیادہ اہم نہیں جتنا ذیل کے دو پہلو۔

۱۔ اس نسخے کے جملہ مشمولات یعنی متن، اصلاحیں اور حاشیے کی غزلیں غالب ہی کی تصنیف ہیں۔

۲۔ یہ مخطوطہ نسخۂ بھوپال اول سے پہلے کی منزل ہے۔

اگر ان دونوں باتوں کو تسلیم کر لیا جائے تو اس بات کی اہمیت محض ضمنی رہ جاتی ہے کہ اس کا کاتب غالب ہے کہ نہیں۔

اردو کے معروف شاعر کمال احمد صدیقی ریڈیو کشمیر سری نگر میں کام کرتے ہیں۔ انھوں نے اس نسخے کو جعلی ثابت کرتے ہوئے چار سو صفحوں کی کوئی کتاب لکھی ہے جو زیر طبع ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ نسخہ نہ غالب کی تحریر ہے نہ غالب کی تصنیف بلکہ ۱۹۶۹ء میں تیار کیا ہوا جعل ہے۔ وہ کتاب کی اشاعت سے پہلے اپنے دلائل کا ایک شمہ بتانے کو تیار نہیں۔ میں نے ڈاکٹر انصار اللہ سے کمال صاحب کی اس رائے کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ یہ زیادتی ہے۔ نسخہ غالب ہی کی تصنیف ہے گو اس کی تحریر نہیں۔

اردو دنیا کو انصار اللہ صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ وہ اس نسخے کو (غالباً کچھ مستثنیات کے ساتھ) غالب ہی کا مصنفہ مانتے ہیں۔ وہ اسے نسخۂ بھوپال سے بعد کی تصنیف اور تحریر مانتے ہیں۔ یہ ایسا نکتہ ہے جس پر ان سے اتفاق ممکن نہیں لیکن مزید بحث و تکرار کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

وہ اپنا منھ اُدھر کر لیں ہم اپنا منھ اِدھر کر لیں

اب ایک دلچسپ انکشاف سنئے۔ ادارۂ ہماری زبان کو بھوپال سے کسی عبد العزیز کا مراسلہ موصول ہوا ہے جو ہماری زبان میں فوراً شائع ہونا چاہئے۔ اس میں ایسا کچھ لکھا ہے۔

"بھوپال میں غالب کے نام سے ایک غزل تصنیف ہوئی تھی جسے جوہر قریشی صاحب نے بعض اخباروں میں اشاعت کے لئے بھیج دیا تھا۔ انھیں جوہر صاحب نے عبد العزیز صاحب سے کہا کہ ابھی تو میں نے غالب کی محض ایک غزل پیدا کی ہے۔ جب میں غالب کا ایک پورا دیوان برآمد کروں گا تو دیکھنا۔ غالب پرست دیوانے ہو جائیں گے اور گریبانوں کو پھاڑ دیں گے۔ کچھ عرصے بعد عبد العزیز صاحب کو ایک کاتب ملا۔ اس نے بتایا کہ آج کل جوہر صاحب اس سے ایک دیوان کی کتابت کرا رہے ہیں لیکن اس میں تخلص کی جگہ چھوڑی ہوئی ہے۔ عبد العزیز صاحب بھوپال میں مخطوطۂ غالب کے مقدمے کے دوران خاموش رہے۔ اب اس راز کا اعلان کرنا چاہتے ہیں۔"

ادارہ ہماری زبان نے اس مراسلے کو اشاعت سے روکا ہوا ہے کیونکہ اس کا دعویٰ غیر مصدقہ ہے۔ میری رائے میں یہ انکشاف ادبی تحقیق سے زیادہ سی۔ آئی۔ ڈی کی تفتیش کے شایاں ہے۔ بھوپال کے محققوں کو عبد العزیز صاحب کا پتہ معلوم کر کے دیکھنا چاہئے کہ وہ کہاں تک ثقہ راوی ہیں۔ اس کے بعد محولہ کاتب کی تلاش کر کے اسے نئے مخطوطے کا ایڈیشن دکھا کر پوچھنا چاہئے کہ کیا اس نے اس کی نقل کی تھی۔ جوہر قریشی کی کوئی علمی شخصیت نہ تھے ان سے یا بھوپال کے کسی اور شخص سے یا ملک کے کسی اور عالم سے یہ ممکن نہیں کہ وہ نسخے کے نو دریافت اشعار اور سینکڑوں متداول اشعار کا فرسودہ متن تصنیف کر سکے۔ اگر جوہر قریشی نے اسی دیوان کی نقل کرائی تھی تو محض یہ صورت ہو سکتی ہے کہ انھیں یہ نسخہ کئی سال پہلے مل گیا ہو اور انھوں نے اس کی کوئی نقل کرائی ہو۔ حال میں اس دیوان کی تصنیف ہوئی ہے ایسا گمان ہے جسے میں کلام کی نوعیت کی بنا پر ہرگز نہیں مان سکتا۔ اس مراسلے کی اشاعت اور اس پر چھان بین کی ضرورت ہے۔

جون۔ • گیان چند

نوٹ:۔ محولہ بالا مراسلے کی اشاعت اگلے شمارے میں ہوگی۔ (ادارہ)

انجمن کی خبریں

محبوب نگر میں اردو کی جماعتوں اور اساتذہ کے تقرر کی اپیل

محبوب نگر:- جناب نصرت فاروقی معتمد انجمن ترقی اردو ضلع محبوب نگر کے ایک بیان کے بموجب مہتمم تعلیمات محبوب نگر کو ایک یادداشت پیش کی گئی ہے جس میں جاریہ سال سے اچم پیٹ نگر کرنول اور نارائن پیٹ کے تحتانی مدارس میں اردو کی پہلی جماعت اور کلواکرتی میں اردو کی (۸) ویں جماعت اور مدور میں اردو کی (۵) ویں جماعت قائم کرنے کی اپیل کی گئی ہے۔ یادداشت میں ناگر کرنول کلواکرتی اور بادے پلی کے ہائی اسکولس میں سائنس اور ریاضی کے گریجویٹ اساتذہ کے انتظام پر بھی زور دیا گیا ہے۔

سیاست حیدرآباد

اردو جماعتوں کے قیام کا مطالبہ

معتمد انجمن ترقی اردو جنگاؤں نے ناظم تعلیمات آندھرا پردیش اور مہتمم تعلیمات ورنگل کو ایک یادداشت کے ذریعہ مستقر جنگاؤں اور مواضعات کے مدارس پر نئے تعلیمی سال کے آغاز سے جہاں اردو ذریعہ تعلیم کے طلبہ کی کثیر تعداد ہے اردو جماعتوں کا آغاز کرنے اور اس مقصد کے لئے اردو اساتذہ کی فراہمی کا مطالبہ کرتے ہوئے اس امر کا خدشہ ظاہر کیا کہ مزید تاخیر اردو طلبہ کے لئے نقصان رساں رہے گی۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش سے خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ بھی اس خصوص میں ارباب تعلیمات کو توجہ دلائے۔

• رہنمائے دکن

اردو جماعت ہشتم کا قیام

معتمد انجمن ترقی اردو بدا پلی نے اردو ششم کے کامیاب طلبہ کے لئے ہشتم اردو کے قیام و منظوری کے تعلق سے جناب مجیب یار خاں بلاک ڈیولپمنٹ افسر بدا پلی کی توجہ مبذول کرائی موصوف نے عاجلانہ انتظام کا وعدہ کیا ہے نیز متعلقہ دفاتر کے عہدہ داروں کو بھی اس سلسلہ میں تحریکیں کی جاچکی ہیں کہ مناسب اردو داں ٹرینڈ اساتذہ کے تقررات پر زور دیا جائے فی الحال بلاک کے تحت اردو ٹیچروں کے بندوبست سے اردو داں طلبہ کی ہمت افزائی ہوگی۔

• رہنمائے دکن

انجمن ترقی اردو رام گنڈم کے انتخابات

رام گنڈم:- انجمن ترقی اردو شاخ رام گنڈم ضلع کریم نگر کے عہدہ داروں کے انتخابات عمل میں لائے گئے جناب محمد محمود علی (صدر) محمد یعقوب علی (نائب صدر)، محمد عبدالرشید (معتمد)، محمد شفیع الدین (نائب معتمد) اور سید فخرالدین (خازن) منتخب ہوئے۔

• سیاست حیدرآباد

اردو گھر کی تعمیر کیلئے عطیوں کی اپیل

حیدرآباد:- مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کی مجلس عام کے اراکین پروفیسر حبیب الرحمٰن، جناب عابد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ "سیاست"، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، مسٹر شیواس لاہوٹی اور ڈاکٹر حسینی شاہد پرنسپل اردو آرٹس کالج نے آندھرا پردیش کے اردو داں اصحاب سے اپیل کی ہے کہ وہ مرکزی انجمن ترقی اردو کی عمارت اردو گھر کے تعمیر فنڈ میں زیادہ سے زیادہ عطیات دے کر سرمایہ کی فراہمی کو کامیاب بنائیں۔ اپیل میں کہا گیا ہے کہ دلی میں اردو گھر کی تعمیر کا آغاز ہوچکا ہے جس کے اخراجات کا اندازہ آٹھ لاکھ روپیہ کیا گیا ہے جو بڑھتی ہوئی قیمتوں کے پیش نظر ۹ لاکھ تک جاسکتا ہے۔ انجمن کے تعمیر فنڈ میں ڈیڑھ لاکھ کے قریب رقم محفوظ ہے۔ حکومت ہند کی طرف سے چار لاکھ کے عطیہ کا اعلان ہوچکا ہے۔ اس طرح اردو گھر کی تعمیر کی تکمیل کے لئے کم و بیش ساڑھے تین لاکھ روپے مزید درکار رہوں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ آندھرا پردیش بھی اس مہم میں شایان شان حصہ لے گا مرکزی انجمن کی طرف سے تعمیر فنڈ کی رسیدیں جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست کو وصول ہوچکی ہیں۔ اردو دوستوں سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ دفتر سیاست میں عطیے جمع کر کے رسیدیں حاصل کریں۔



اخبار و اذکار

اردو کے یونیورسٹی ٹیچروں کی کل ہند کانفرنس کے سلسلے میں جلسہ

لکھنؤ:۔ کل ہند یونیورسٹیوں کے اردو اساتذہ (اردو اساتذہ جامعات ہند) کی چوتھی سالانہ کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کی صدارت میں ایک مشاورتی جلسہ ہوا جس میں نسیم قریشی ریڈر اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے اردو فارسی شعبہ کے تمام اساتذہ جلسہ میں شریک ہوئے۔

پروفیسر آل احمد سرور صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور صدر اردو اساتذہ جامعات ہند کے ایک خط کی روشنی میں ہونے والی کانفرنس کا پروگرام طے کیا گیا۔ کانفرنس کا افتتاح ۳۰ر ستمبر کو ہوگا اور کانفرنس ۲ر اکتوبر تک جاری رہے گی اور اس کے ۶ اجلاس ہوں گے۔ کانفرنس میں درس و تدریس کے مسائل نصاب تعلیم تحقیق و تنقید اور اردو یونیورسٹی اور دوسرے ضروری مسائل پر غور اور مباحثہ ہوگا۔

اس سہ روزہ کانفرنس کے چھ اجلاس کے سلسلے میں ہر اجلاس کا ایک کنوینر بھی منتخب کیا گیا۔ کانفرنس کی تنظیم کے سلسلے میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی جنرل سکریٹری اور آفس سکریٹری ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ہوں گے۔

کانفرنس کا افتتاح کرنے کے لئے ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی گورنر اتر پردیش اور چانسلر لکھنؤ یونیورسٹی سے درخواست کی جائے گی۔ کانفرنس کے سلسلے میں مجلس استقبالیہ کے چیرمین وائس چانسلر لکھنؤ یونیورسٹی ہوں گے اس کانفرنس کے سامنے ایک اردو یونیورسٹی کا مسئلہ سب سے اہم مسئلہ ہوگا۔ • قومی آواز لکھنؤ

بنگلہ دیش کے سلسلے میں اردو اخبارات قومی پالیسی کے حامی ہیں

نئی دہلی:۔ وزیر اطلاعات و نشریات کے سوالات زد کا جواب دیتے ہوئے مسز نندنی ست پتی وزیر مملکت نے فرقہ پرست اور فسطائی عناصر کے الزام کی پرزور تردید کی اور کہا کہ بنگلہ دیش کے سلسلے میں اردو اخبارات قومی پالیسی کی حمایت کر رہے ہیں اگر وہ ایک اخبارات ایسا نہیں کر رہے ہیں اور انھوں نے اپنی پالیسی نہیں بدلی تو ان کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ انھوں نے اخبارات کی اجارہ داری کو ختم کرنے کا اعلان کیا اور کہا کہ چھوٹے اور درمیانہ اخباروں کی مدد کے لئے کارپوریشن بنایا جائے گا۔ قانون بنانا زیر غور ہے کہ بڑے اخبارات

حساب کتاب دینے پر مجبور رہوں۔ • الجمعیۃ دہلی

اسکولوں میں اردو کا اہتمام ضروری ہے کانگریسی لیڈروں کا مطالبہ

دلی:۔ شری رام چرن اگروال اور سوشیل چند گپتا صدر و جنرل سکریٹری دلی سینٹرل ضلع کانگریس کمیٹی نے ایک پریس بیان شائع کیا ہے۔ جس میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ پاس ہونے والے ہر طالب علم کو اس کی رہائش گاہ کے قریب داخلہ دیا جائے۔ مختلف کالجوں میں دوسری شفٹ چالو کی جائے۔

اردو لینے والے طلبہ کی سہولت کا انتظام کیا جائے مسلم علاقوں کی لڑکیوں کے لئے ماتا سندری کالج میں اردو کا اہتمام کیا جائے۔ • الجمعیۃ دہلی

دلی سول ڈیفنس کا لسانی تعصب

دلی:۔ دلی سول ڈیفنس والوں کا اردو آبادی کے ساتھ مسلسل یہ سلوک جاری ہے کہ وہ جب بلیک آؤٹ کا فیصلہ اور اعلان کرتے ہیں تو وہ اردو داں طبقے کو اپنی ہدایات اور ان کی خلاف ورزیوں کی صورت میں تعزیری کارروائی کے متعلق آگاہ کرنے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھاتے وہ انگریزی اور ہندی میں تو پوسٹر شائع کرتے ہیں لیکن اردو میں کبھی پوسٹر شائع نہیں کرتے اس طرح اردو پڑھے لکھے لوگ ان کی ہدایات سے بالکل نابلد رہتے ہیں اور شہری معاملات میں یہ امتیاز اور لسانی تعصب مجرمانہ نوعیت کا ہے۔ • الجمعیۃ دہلی

اردو کے طلبہ کے ساتھ فرق برتے جانے پر احتجاجی بھوک ہڑتال

سہارنپور:۔ نوجوان سبھا نے اردو کو اس کا آئینی حق دلانے کے سرکاری وعدوں اور سرکاری و نیم سرکاری تعلیمی اداروں میں داخلے کے بارے میں پیش آنے والی دقتوں اور امتیازی روش کی جانب ضلع حکام و سرکار کی توجہ مبذول کرانے کے لئے ۱۵ر جولائی سنہ ۷۱ء کو کلکٹر صاحب کے اجلاس کے سامنے ۲۴ گھنٹے کی علامتی بھوک ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

نوجوان سبھا نے محبان اردو سے درخواست کی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں تعاون کریں اور اپنے اپنے اضلاع میں اس قسم کی تحریکیں چلا کر فروغ اردو میں حصہ لیں۔

• الجمعیۃ دہلی

(صفحہ ۱۲ سے آگے)

کی فراوانی اور بوقلمونی کو احساسات کے آئینے میں پیش کرنے کے لئے۔ لیکن ڈرامہ نگار کی عظمت اور آفاقیت کے باوجود ہم اس کے کارناموں کو کلیتہً اس کے ماحول، یعنی اس کے پس منظر میں موجود ذہنی اور مذہبی روایات سے منقطع کرکے نہیں دیکھ سکتے۔ نشاۃ ثانیہ کی بہت سی اقدار حیات عہد وسطیٰ کی اقدار کا تکملہ اور اتمام پیش کرتی ہیں۔ مذہب کے اس پہلو سے جسے ہم (ECCLESIASTICAL) کہہ سکتے ہیں شیکسپیئر کو کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔ اسے کلیسا کے نظم، اس کے عہدوں کی تقسیم اور اس کی سیاست سے کوئی ہمدردی نہیں۔ لیکن مذہب کا تعلق مابعد الطبیعاتی مسائل اور اخلاقیات دونوں سے ہے اور دونوں کے سلسلے میں شیکسپیئر کا نقطۂ نظر عیسائیت کے نقطۂ نظر سے مختلف نہیں ہے۔ ٹالسٹائے کو اس بات کی شکایت تھی کہ دنیا کے اور بڑے فن کاروں کے برعکس شیکسپیئر کے یہاں گہرے مذہبی احساس کی کمی ہے۔ لیکن اس کے بڑے المیہ کارناموں اور بعد کے کارناموں کے گہرے اور محتاط مطالعے سے اس مفروضے کی تکذیب ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ اضافہ کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ اس کے ابتدائی طربیہ کارنامے بھی غیر سنجیدہ لامقصدیت کے حامل نہیں ہیں۔ ان کے عقب سے بھی عیسی زندگی کی ایک تصویر ابھرتی ہے۔ ان کی کائنات میں بھی اخلاقی نظم کا ایک تصور پایا جاتا ہے جس پر زندگی بالآخر منتج ہوتی ہے اور ان کے تانے بانے میں بھی خیر و شر کے درمیان امتیاز دکھایا گیا ہے جس کی روشنی میں حیات انسانی کی شیرازہ بندی ممکن ہے۔

اب ایک نظر المیہ ڈراموں، مسائلی (PROBLEM) ڈراموں اور رومانوں" پر ڈالنا ضروری ہے تاکہ مذکورہ بالا مفروضات کی نوعیت واضح ہو سکے۔ مشہور المیہ ڈراموں میں (KING LEAR) کو لیجئے۔ بیشک اس کا بیرونی ڈھانچہ اور اس کی فضا ایک حد تک (PAGAN) ہے، لیکن کیا کوئی شخص اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ اس ڈرامے میں خالق کائنات کے وجود کے بارے میں قیاس آرائی، خدا اور کائنات کے درمیان تعلق اور ربط کی نوعیت اور انسان کے لئے مشیت ایزدی کی توجیہہ یا بہ الفاظ دیگر (THEODICY) مرکزی مسائل میں سے ایک ہے۔ یہاں بوڑھے بادشاہ کے غم اور مصائب ایک تخلیقی نوعیت کے ہیں۔ کیونکہ یہ بالآخر وسیلہ بنتے ہیں۔ اس کے انکسار اور خودشناسی کے حصول کا۔ ڈرامے کا نقطۂ عروج محبت کے اصول کی فتح کو قرار دیا جا سکتا ہے لیر میں نمایاں تبدیلی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب اپنی انانیت اور خودکفیلی (SELF-SUFFICIENT) ہونے کی حالت میں شکست وریخت کے سبب وہ ایک نئی بصیرت، کشادگیٔ قلب و نظر اور عفو و درگزر کا حامل بن جاتا ہے۔ اپنے مصائب کے نقطۂ انجام پر پہنچ کر اس میں ایک حقیقی جذبۂ رحم بیدار ہوتا ہے۔ وہ خدا کی طرف بھی جھکتا ہے اور انسانوں سے کامل ہم آہنگی کا بھی احساس کرتا ہے۔ اپنی سپیدہ سے چھوٹی اور تہی ہستی کا تصور وہ (SOUL IN BLISS) کی ترکیب استعمال کرکے کرتا ہے۔ دوسرا اہم کردار گلاسٹر بھی جو شروع میں نفس پرست، متکبر اور تنگ نظر ہے قلب ماہیت کے عمل سے گزرتا ہے کنگ لیئر کی طرح وہ بھی آزمائش و ابتلا کا تجربہ کرنے کے بعد ایک نئی اور حیرت انگیز بصیرت حاصل کرتا ہے۔ جس طرح بوڑھے بادشاہ کی زندگی کے متن پر پچھتاوا اور صبر جلی حروف میں لکھے نظر آتے ہیں، اسی طرح گلاسٹر تشکیک سے ایمان کی منزل کی طرف سفر کرتا ہے۔ آخر میں دونوں کی زندگی اور فکر کا انداز سینٹ پال کی تعلیمات کی شرح بن جاتا ہے۔ اس ڈرامے میں ایڈگر کا کردار شیکسپیئر کے اپنے وجدان کا اشاریہ معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں خدا پر بھروسے سے مفر نہیں، لیکن خدا ہماری خواہشات کا پابند نہیں۔ اس ڈرامے میں چاہے کارڈیلیا موت کے منہ سے نہ بچائی گئی ہو لیکن شر کی قوتیں بہر صورت کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتیں۔ بوڑھا لیئر مصائب کے جہنم اور برزخ سے رحمت (GRACE) کی بہشت کی طرف بلا شبہ جادہ پیما ہوتا ہے۔ ڈرامے میں جگہ جگہ انجیل مقدس کے محاکات سے جس طرح کام لیا گیا ہے وہ بھی غور طلب ہے۔

(باقی آئندہ)

اسلوب احمد انصاری

میرا صفحہ

انگریزی ادب بلکہ عالمی ادب کی تاریخ میں شیکسپیئر کا کارنامہ لازوال بھی ہے اور تقابل اور موازنے سے بے نیاز بھی۔ اس کے فن کا وسیلۂ اظہار ڈرامہ ہے، اور اس لیے اس کی تخلیقات کے مطالعے سے اس کی اپنی آراء کے استنباط کا معاملہ بغایت احتیاط چاہتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر کرداروں کی زبان سے جن عقائد، احساسات اور خیالات کا اظہار ڈرامے کے دوران کیا گیا ہے ان سے خود ڈرامہ نگار کے معتقدات کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنا دقت طلب کام ہے۔ بایں ہمہ ڈرامے کی مجموعی فضا، اس میں تواتر کے ساتھ مستقل محاکات اور لفظی پیکر، اس میں بعض معاملات کی طرف ڈرامہ نگار کے طبعی جھکاؤ، کرداروں کی تقدیر میں مستتر اقدار کی طرف اس کے رجحان، ان مرکزی تصورات کے پیش نظر جو ڈرامے کے پس منظر میں موجود ہیں، بلکہ ایک طور سے اس پر حاوی ہیں اور ان ترجیحات کے لحاظ سے جو مصنف نے ڈرامے کے ماخذ میں کئے ہیں، ہم کسی نہ کسی نتیجہ پر ضرور پہنچ سکتے ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ نہ صرف ایک پورے ڈرامے کو تمام و کمال ذہن میں رکھا جائے، بلکہ ڈرامہ نگار کے کارنامے کی کلیت (TOTALITY) بھی پیش نظر ہے۔ کیونکہ مختلف ڈرامے ایک پورے کل کے اجزاء ہیں اور یہ بات ظاہر ہے کہ اس کل کے مطالعے سے جو نقش ابھرے گا، وہ محض ایک جزو کے مطالعے کی نسبت زیادہ اہم نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔

جس مسئلے سے ہم اس وقت بحث کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ کیا شیکسپیئر کے ڈراموں کا کوئی مذہبی پہلو ہے یا نہیں؟ بہ الفاظ دیگر کیا ہم ان کی تعبیر و تفسیر مذہبی بنیاد پر کرنے میں حق بجانب کہے جا سکتے ہیں؟ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ عام رجحان یہ تھا کہ شیکسپیئر کے بڑے المیہ کارناموں کی فضا نا مذہبی (SECULAR) ہے۔ چنانچہ مشہور نقاد اے۔ سی۔ بریڈلے نے اسی پہلو پر زور دیا ہے۔ گو اس نے دبی زبان سے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ ان ڈراموں کی کائنات میں ہمیں ایک عظیم ان دیکھی طاقت کے وجود کا احساس ہوتا ہے، جو ہم پر حکمراں ہے، اور جس کی طرف ہمارا رویہ عبودیت اور انکسار کا معلوم ہوتا ہے۔ جدید ترین میلان یہ ہے کہ بعض اہم ڈراموں کی تنقید مذہبی، اساطیری بنیاد پر کی گئی ہے اور ان کی تہ میں واضح مذہبی عناصر کی موجودگی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ گو اس کے ساتھ ہی بعض دوسرے میلانات بھی سامنے آتے رہے ہیں۔ البتہ شروع ہی میں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کی مذہبی روح سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ ان میں مذہبی قانون (DOCTRINE) یا راسخ مذہبی عقائد کا منظم طور پر پرچار کیا گیا ہے۔ یا ان میں مذہبی عقائد سے بھرپور ناصحانہ مکالمے یا خود کلامیاں ملتی ہیں، بلکہ اس سے منشا یہ ظاہر کرنا ہے کہ شیکسپیئر کے ڈرامے جس ذہن اور ادراک کا ماحصل ہیں اس ذہن اور ادراک کی تشکیل میں مذہبی اقدار زندگی موجود ہیں، اور یاپان کار وہ ان ڈراموں میں ستر پردوں کے باوجود جھلکتی نظر آتی ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ کسی بھی بڑے ڈرامہ نگار کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ مذہبی یا اخلاقی اقدار کا براہ راست پرچار اپنے کارناموں میں کرے، انگلستان کی تاریخ میں یہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ۱۵۵۹ء اور ۱۶۰۶ء میں بالترتیب ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کے مطابق اس بات کی مخالفت کی گئی تھی۔ کہ کوئی ڈرامہ نگار اپنے ڈراموں میں نہ خدا کا نام لینے پائے اور نہ مذہبی خیالات اور عقائد کا اظہار کرے، اس لئے اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ شیکسپیئر نے اپنے اکثر مشہور ڈراموں کا بیرونی ڈھانچہ کلاسیکل اور بت پرستی (PAGAN) رکھا ہے۔ پھر یہ امر بھی غور طلب ہے کہ ڈرامے کے اندر مختلف کردار اپنی انفرادیت باقی رکھتے ہیں اور بعض دفعہ نہ صرف مختلف بلکہ متضاد نقطہ ہائے نظر کا اظہار کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض نقطۂ نظر، روایتی بلکہ ادبری اور سطحی بھی ہو سکتے ہیں۔ بعض طنزیہ نشتر کے حامل، بعض محض کسی مخصوص اثر کو پیدا کرنے میں معاون ہوتے ہیں اور بعض سچے اور گہرے جذبات اور پختہ عقیدے اور ایمان پر مبنی۔ لیکن پھر بھی مجموعی طور پہ یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ ڈرامے میں غالب اور مرکزی نقطۂ نظر، جس کے حق میں شہادت زیادہ سے زیادہ ہو، کون سا ہے۔ اور زندگی اور کائنات کے بارے میں کن مسائل اور تنقیحات کا احاطہ اس میں کیا گیا ہے۔ اس میں جو اخلاقیات ملتی ہے، اسے کس شریعت یا مذہب سے مختص کیا جا سکتا ہے۔

غالباً اس امر کے ماننے میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ شیکسپیئر کے ڈرامے محض تفنن طبع کے حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے اپنے ڈرامے کسی بندھے ٹکے فلسفۂ زندگی یا کسی خاص نقطۂ نظر کی نشر و اشاعت کی غرض سے نہیں لکھے بلکہ زندگی

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم۔ اے نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھپوا کر دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا
REGD-NO. L. 922 فون نمبر ۲۹ R.NO. 2186/57